خواجہ غلام السیدین
ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

امن و آشتی کا مذہب، اسلام
(II)

مکہ اور مدینہ کے جن باشندوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ نے اپنا پیغامِ امن پیش کیا تھا، ان میں زبردست مخاصمت رہی تھی اور کئی بار خونریز لڑائیاں بھی ہوئی تھیں۔ مگر یہ آپ کی شخصیت اور تعلیمات کا معجزہ تھا کہ اسلام قبول کرتے ہی ان خوں خوار لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ اسلام نے صرف محبت، اخوت اور مساوات ہی کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ سبق بھی سکھایا کہ وہ اپنے اندر اور اپنے قبائل میں ایسے لوگ پیدا کریں جو دوسروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے خود کو وقف کر دیں۔

> ''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت بلاتے نیک کاموں پر اور حکم کرتے پسند بات کو اور منع کرتے ناپسند کو اور پہنچے وہی مراد کو۔'' (۱۰۴:۳)

اس تعلیم کی صدائے بازگشت ہمیں صرف مذہبی صحائف ہی میں نہیں بلکہ اس عہد کی ثقافت، شعر و ادب اور مسلمانوں کے فلسفے میں بھی ملے گی جیسا کہ یہ بلاشبہ دوسری ثقافتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر غالب نے اسی بات کو حکیمانہ ایجاز کے ساتھ یوں کہا ہے:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب 'انا' دوسروں کی 'انا' کے لیے لبیک کہنے والی اور بہت حساس ہو جائے۔ اُن کے دُکھ سکھ میں شریک ہو، اُن سے قوت حاصل کرے اور انہیں قوت عطا کرے، تب کہیں زندگی اپنے پورے امکانات اور صلاحیتیں ظاہر کرتی ہے۔

علامہ اقبال جو نظریۂ خودی کے علاوہ تعلیماتِ اسلامی کی روح اور اُس کے فلسفے کے ترجمانوں میں سے ایک ہیں، یہ مانتے ہیں کہ شریفانہ، انسانی اور پرعزم انداز میں اپنی 'انفرادیت' پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ایک فرد اپنے آپ کو اس عظیم تر مجموع کا حصہ بھی سمجھے جس میں نہ صرف تمام دُنیا کے مرد و زن بلکہ یہ ساری کائنات اور خود الوہیت کی حقیقت بھی شامل ہے۔

اُن کی دو شاہکار فارسی مثنویوں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کا پیغام بھی یہی ہے کہ انفرادیت (خودی) اُس وقت تک پختہ نہیں ہوسکتی، نہ اُس کی پوری قوت بروئے کار آ سکتی ہے جب تک وہ سمندر کے موتی کی طرح انسانیت کے محیط میں ڈوب کر اس کا ایک حصہ نہ بن جائے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی سرسری طور پر اشارہ کر چکا ہوں، انسان جسے عملِ ارتقاء پورا کر کے ایک آفاقی انسان بننا ہے، اس وسیع و بیکراں کائنات میں کوئی غیر اہم یا حقیر ذرہ نہیں ہے جیسا کہ وہ صدیوں سے سمجھتا آ رہا ہے بلکہ وہ اس کائنات کا مرکز اور مفہوم ہے۔ اس کے بغیر یہ کائنات بے معنی ہوتی، اور جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے، بے جان اور سرد پڑی رہتی اگر اُسے انسان کی ذہانت، سمجھ بوجھ اور محبت نے زندگی کی یہ ہمک نہ بخش دی ہوتی۔ یہی انسان کا مقصدِ اعلیٰ ہے، وہ قدریں ہیں اور اس بے جان کائنات کو اہمیت اور رنگ و آہنگ عطا کرتی ہیں۔ بظاہر یہ بہت بلند بانگ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات اپنے تمام نظام ہائے شمسی، کھربوں ستاروں اور بے شمار انواعِ حیات کے ساتھ انسانی زندگی کے ڈرامے کا صرف پس منظر ہیں۔ لیکن تمام لامتناہی بحثوں کے باوجود جواب تک اس موضوع پر ہوتی رہی ہیں، بھی بڑے مذاہب کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے۔

انسان فضائے کائنات میں تحلیل ہو جانے والا کوئی شرارہ نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی اس مقصد تکوین کا ایک حصہ ہے جسے مذاہب کی اصطلاح میں 'حکمتِ الٰہیہ' کہا جاتا ہے۔ اس دُنیا میں انسان کے اعمال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر ﷺ اس عظیم نظام اور ضابطے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے جو کائنات میں نظر آ رہا ہے اور جسے وہ محض 'اتفاقات' کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آپ قرآن کے لفظوں میں بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں:

''ربنا ما خلقت هذا باطلا۔''

(اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔)

اور درحقیقت یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو اسلام پیش کرتا ہے:

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو، مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب۔ بولے: کیا تو رکھے گا اُس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون۔ اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔ کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔''

(البقرۃ:۳۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے ارادے کا اعلان کیا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا تو اس کے فرماں بردار فرشتوں نے اس فیصلے کے خلاف دبے لفظوں میں احتجاج کیا اور کہا کہ انسان زمین پر خون بہائے گا اور فساد برپا کرے گا جو اُسے وراثت میں ملا ہے۔ اس پر ارشادِ باری ہوا: ''انی اعلم ما لاتعلمون'' (میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) یعنی وہ ایسا کرتو ضرور سکتا ہے کیونکہ اُسے خیر و شر میں تمیز کا اختیار دیا جائے گا مگر اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ ساری کائنات کو حسن اور خیر سے بھر دے، اس میں معنویت پیدا کر دیا اور اس طرح زمین پر خدا کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو۔ اپنی ایک خوبصورت نظم میں جس کا عنوان 'میلادِ آدم' ہے۔ اقبال نے کائنات میں انسان کے رول کے اس عظیم ڈرامے کو اس طرح پیش کیا ہے اور یہ قرآن کے مجموعی اندازِ فکر سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرتِ آشفت کہ از خاکِ جہاں مجبور خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل حذرائے پردگیان، پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات چشم و اکرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عصر
تا ازین گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس طرح انسان عالمِ ناسوت و لاہوت دونوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ تمام مخلوقات میں شامل ہے جن میں عالمِ نباتات بھی ہے، جسے ابھی کچھ زمانہ پہلے تک بے جان مانا جاتا تھا۔ دوسری طرف وہ عالمِ ملکوت کو پانے کا خواہش مند ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے خمیر میں شہیطنت اور ملکوتیت کا حیرت انگیز امتزاج بھی ہے یعنی ایک طرف تخلیق و تعمیر کی قوتیں ہیں تو دوسری جانب تخریب و فساد کی۔ ورثے میں ملے ہوئے یہ تضادات ہی کائنات میں اُس کے ڈرامائی رول کا تعین کرتے ہیں اور یہی اس کی زندگی کے کامیاب یا المناک ہونے کا راز ہیں اور اسی راز کو سمجھنے سے فرشتے قاصر رہے تھے۔ قرآن کے الفاظ میں:

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''
(الاحزاب، ۷۲:۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے انسان کی دورُخی تقدیر کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''ہم نے بنایا آدمی خوب سے خوب اندازے پر، پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے مگر جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں سو اُن کو

نیگ ہے بے انتہا۔'' (۹۵:۴-۵)

بالفاظِ دیگر وہ اعلیٰ ترین بلندیوں تک پرواز کر سکتا ہے کیونکہ اللہ نے اُسے 'احسن تقویم' سے پیدا کیا ہے اور دوسری طرف 'اسفلِ سافلین' میں بھی گر سکتا ہے، اگر وہ اپنے اس اختیارِ تمیزی کا استعمال نہ کرے جو اُسے خیر کو فروغ دینے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ چاہے اُس کا اظہار نیکی کے محدود مفہوم میں ہو یا اُن وسیع تر معنوں میں جن میں صداقت، حسن اور محبت بھی شامل ہیں اور جسے کورنتھی مناجات میں 'عظیم ترین' کہا گیا ہے۔ انسانی فطرت کی اس دورُخی کو بہت سے بالغ نظر مفکروں اور مصنفوں نے پہچانا ہے:

> ''اعمالِ انسانی کا ایک بڑا حصہ خوبصورتی کو مسخ کرنے، صداقت کو خورد برد کرنے، انصاف کو ناکام اور خیر کو بے راہ بنانے پر منتج ہوتا ہے۔ الوہی صفات رکھنے والی اس مخلوق میں ایک شیطان بھی چھپا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کی زندگی اپنی تمام الوہی صفات کے باوجود اعمال و افکار میں دائمی تضادات کا شکار ہے۔''

مذہب کا کام ایک طرف تو ان تضادات کو دُور کر کے انسان کو اوپر اُٹھانا ہے اور دوسری طرف اس آفاقی انسان کی نشوونما کو فروغ دینا ہے جو اس قید خانے کی اُن دیواروں کو توڑ سکتا ہے جو اس کی روح کا تابوت بن گئی ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ حقیقی انسانی آزادی کی صبح میں آنکھیں کھول سکے گا، جہاں تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح برتاؤ کریں اور آپس میں ہمدردی، رفاقت اور مصنفانہ برتاؤ کے ساتھ بسر کر سکیں۔ مذہب اس مقصد کو صرف اس طرح حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ ان صفات کے پسندیدہ ہونے کی تبلیغ کو کافی سمجھ لے، اتنا تو بسا اوقات فلسفی، سیاسی مفکرین یا خیال پرست مصنفین بھی کرتے رہتے ہیں۔ مذہب نے اپنے بانیوں اور بعض برگزیدہ پیروکاروں کی زندگی میں نئے انداز کی شخصیت کا مثالی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ لوگ کسی حد تک زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہیں جن میں اُن کے معاصرین زندہ تھے، کام کرتے اور سوچتے تھے یا اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ایسی مثالی شخصیات کا اثر

صرف لفظوں میں بیان کیے ہوئے خیالات سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی بدولت نا قابلِ یقین تیزی کے ساتھ پورے عہد کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے صرف خیالات ہی کافی ہوا کرتے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض غیر مذہبی مفکرین نے بھی اتنے ہی گہرے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ اول الذکر طبقے کی اخلاقی گرفت بھی مذہبی رہنماؤں کے اثر کی طرح مضبوط اور دیرپا رہی ہے۔ دُنیا میں انقلابی تبدیلیاں لانا صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب خیالات، اقدار، ایقان اور نا قابلِ شکست عقیدہ کسی کی شخصیت میں رچ بس جاتے ہیں اور اس کی زندگی دائمی طور پر اس سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

مہاتما بدھ، عیسیٰ مسیح، کرشن جی اور حضرت محمد ﷺ آفاقی انسانوں کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اب ہندی یا فلسطینی، عربی، کالے، سرخ یا گورے نہیں ہیں۔ یہ اپنے اپنے انداز کی 'حقیقی شخصیت' بن چکے ہیں اور نہ صرف اپنے عصر حاضر کے پیروکاروں کو، بلکہ نا آفریدہ نسلوں کو بھی ترغیب دے رہے ہیں اور وہ بھی اپنی اپنی روایت کی زنجیریں توڑ کر ایسی ہی 'شخصیت' بنالیں اور یوں اُس تاب ناک منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہیں جو ابھی تک خاصی دُور نظر آتی ہے۔ یہ پیش قدمی انہیں اپنی بہت سی انجانی صلاحیتوں کا احساس کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جب رسولِ اکرم ﷺ کی مثالی شخصیت اور آپ کا اسوۂ حسنہ لوگوں کے باطن کی نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ اپنے حقیر اور ناپائیدار مقاصد اور تمناؤں کو بھول جاتے ہیں جو اب تک ان کی زندگی کا مرکز بنی ہوئی تھیں اور اس دشوار گزار اور سختیوں سے بھرپور راستے کو ترجیح دینے لگ جاتے ہیں جس کی طرف پیغمبر ﷺ کی آواز اور آپ کی اپنی مثال بلا رہی ہے۔ یہی اُن بہت سے لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع کیا۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اُن حیرت انگیز تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایسے حضرات کی زندگیوں میں رونما ہوئیں۔

درحقیقت زمانے کا بے رحمانہ برتاؤ اور مخالف قوتیں اس ضیا پاش تصور کو دھندلا کر

دیتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کارنامہ غیر متعلق اُمور میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ لوگ بھی جو خاص طور سے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں، ظاہر کو باطن پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا وہ المیہ ہے جو ہمیشہ دہرایا جاتا رہا ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والی قوتِ محرکہ نہ صرف اس مذہب کے پیروؤں کی تہذیب اور نظامِ سیرت میں نفوذ کر جاتی ہے بلکہ وہ پوری انسانی میراث کا ایک حصہ اور کبھی کبھی شعوری طور پر محسوس نہ ہو سکنے والا سرمایہ بن جاتی ہے اور انسان کی ایک بڑی جماعت کو براہِ راست یا بالواسطہ متاثر کرتی رہتی ہے۔

اب ہمیں آفاقی انسان کے اس تصور کی بازیافت کرنا ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جو غیر مذہبی اور ادبی سرمایے میں بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس فریب سے بچنا بہت ضروری ہے کہ یہ نظریہ تنہا اسلام ہی کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے مذہب نے اس طرح کا تصور کسی دوسرے انداز یا درجے میں پیش نہیں کیا ہے، یا جو بات اس سے بھی زیادہ گمراہ کن ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اس سے 'حقیقی مسلمان' مراد ہے۔ یہ تو صرف تخیل پر مبنی ایک تمثیل ہے کہ کوئی شخص آفاقی انسان کا لباس زیبِ تن کر کے ایک اچھا انسان کیسے بن سکتا ہے اور یہ وہ مقصود ہے کہ جس کی طرف ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو پورے خلوص کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہیے۔ اسلام نے اس ارتقاء کے لیے کام بھی کیا ہے اور جدوجہد بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہونے کا دعوے دار ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جو دوسرے ادیان اور اُن کے بانیوں میں بھی صداقت کے عنصر کو تسلیم کرتا ہے اور اس صداقت کو اپنے اندر جذب بھی کرتا ہے۔ اس نے اپنے تصور کو لازماً کسی قوم یا نسل یا جغرافیائی علاقے کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مثالی انسان میں بھی اس نظریے کا عکس دیکھنا پسند کرے گا۔

سب سے پہلے تو یہ آفاقی انسان تسلیم ہی نہیں کرتا کہ فروعی اختلافات اور حد بندیاں جن میں ہم الجھے ہوئے ہیں، کوئی وقعت رکھتی ہیں کیونکہ یہ انسانی وفاداری اور خیر سگالی کے اس کے وسیع تصورات سے ٹکراتی ہیں۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے ساتھ

یکساں برتاؤ کرے گا اور غیر مسلموں سے بھی برتاؤ کرنے یا ان کو پرکھنے کے لیے ایک ہی معیار استعمال کرے گا۔ یہ نہیں کہ 'اپنوں' کو جانچنے کے لیے کسوٹی کچھ ہو اور دوسروں کو آنکنے کی کچھ اور:

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ دیکھتا اور سُنتا ہے۔'' (النساء:۵۸)

اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سب انسانوں (الناس = بنی نوع انسان) سے منصفانہ سلوک کرے۔ خوش معاملگی صرف وہ نہیں ہے جو اپنے ہم مذہبوں سے کی جائے۔ کسی بھی طرح کے حالات میں کسی سے بھی ناانصافی کرنے کا جواز نہیں، خواہ وہ بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ''الناس امة واحدة'' (۲:۲۱۳) تمام انسان ایک ہی امت ہیں اور جو اختلافات اُنہیں گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں وہ یا تو اتفاقی ہیں یا پھر اس لیے ہیں کہ اس اختلاف سے وہ پہچانے جاسکیں:

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات:۱۳)

دوسرے موقع پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان نہ صرف اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ احسان (نیکی، مہربانی، تکریم) کا برتاؤ کرے بلکہ دوسرے یتیموں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور ہمسایوں کے بھی کام آئے خواہ ان سے کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ (سورۂ بنی اسرائیل:۲۴ تا ۲۷)۔ اس فرمان کی تائید مزید ایک حدیث سے ہوتی ہے:

''مومن وہ ہے جو کسی کے ساتھ دھوکا دھڑی نہیں کرتا۔ بلکہ

سچا مومن (یعنی سچے عقیدے والا جس کا مرتبہ رسمی 'مسلم' سے برتر ہے)
وہ ہے جو اپنے ہمسایے سے دغا نہ کرے اور جس سے وہ خود کو مامون
سمجھیں۔''

یہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس کے تمام ہمسایے اس سے مطمئن اور مامون ہوں اور انہیں یہ اندیشہ بھی نہ ہو کہ اس سے انہیں کوئی شر پہنچے گا۔ اس طرح ساری کائنات ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ہمسایہ بن جاتی ہے اور جو لوگ ہم سے دُور بھی بستے ہیں وہ بھی ہمارے پڑوسی کہے جا سکتے ہیں۔ اسلام اگر صحیح معنوں میں کسی شخص کی زندگی پر اثر انداز ہو جائے، جو افسوس ہے کہ آج نہیں ہے، تو اس کے برتاؤ اور نظریات میں ایک انقلابی تبدیلی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسلام کا بنیادی پیغام تمام انسانوں کی زندگی میں سرایت کر جائے، یا کم از کم ایک قابلِ لحاظ تعداد کو متاثر کر دے تو اسے بالکل نئی شان و شوکت مل سکتی ہے کیونکہ بہرحال بنی نوع انسان کے مصائب اور مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ اچھا اور منصفانہ برتاؤ کرنے میں ناکام رہے ہیں جو اُن کا حق ہے۔ یہی وہ بات ہے جو انسان کی 'کلیت' کو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے بٹے ہوئے انسان سے نمایاں طور پر جدا کر دیتی ہے۔ یہ صرف افراد کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ قومی رشتوں پر بھی صادق آتا ہے اور یہ ایک ایسا ضروری حکم ہے جس میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔

''ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا
ہے اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے
مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں
اُن میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان
میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ اس کی سزا بہت سخت ہے۔''
(المائدہ:۲)

کسی کو دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ اس بنا پر غیر منصفانہ برتاؤ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اس کا دشمن ہے خواہ اس نے مسلمان کو کعبے میں داخل ہونے سے روکا ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ خیر کے ہر کام میں تعاون کریں، چاہے وہ مسلمان سے سرزد ہو یا غیر مسلم سے اور جس بات میں شر کا پہلو ہو خواہ وہ کسی سے بھی سرزد ہو رہی ہو اُس سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں یہی اصول بیان ہوا ہے:

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔'' (المائدہ:۸)

یہ آیت ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم حق کے لیے ایک جری گواہ بن جائیں اور کوئی اس راہ سے ہمارے قدم نہ ڈگا سکے اور انصاف کرنے کے معاملے میں ذاتی دوستی یا دشمنی کا خیال بالائے طاق رکھ دیں۔ خواہ ہم منصف ہوں یا گواہ، تمام معاملات میں ہمارے کردار کا رہنما اصول یہی ہونا چاہیے۔ اس سے بھی یہ مستنبط ہوتا ہے کہ قومیت کا جو تصور عہدِ حاضر کے ذہن پر گزشتہ دو صدیوں سے قبضہ جمائے ہوئے ہے شاید تمام خوبیوں کا جامع نہیں ہے۔

اس آفاقی انسان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ دُنیا کی کسی بھی تہذیب میں یا کسی بھی خطے میں نیکی کے حصول کے لیے پہنچ جائے۔ ایک مشہور حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحکمۃ ضالۃ المومن فلیًا خذھا اینما وجدھا۔

(دانائی مومن کی متاعِ گمشدہ ہے جہاں بھی اسے پائے، اپنا لے۔)

اس کی ہمدردی، اثر پذیری اور اخذ و تاثیر کی صلاحیت پر کوئی حد بندی نہیں ہے۔ یہی ایک فرد کی حیثیت سے اُس کے ذی استعداد ہونے کی نشانی ہے اور دوسری قوموں یا تہذیبوں کی قدر کرنے کی بنیاد بھی صحیح معنوں میں یہی ہے۔ ایک بار یہ روشنی اسے نظر آ جائے تو پھر کسی

خوف یا مصلحت سے وہ اسے چھپاتا نہیں بلکہ کھلے دل سے اس میں حصہ لینے کے لیے ساتھیوں اور گھر بار سمیت میدان میں آ جاتا ہے اور یہ پروا نہیں کرتا کہ اس میں اُس کا انجام کیا ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جس کا مطالبہ خدا نے تمام انبیائے سابقین سے بھی کیا تھا اور ہمارے پیغمبر ﷺ سے بھی یہی ارشاد ہوا تھا:

''اے پیغمبرؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے، یقین رکھو وہ کافروں کو کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔'' (المائدہ: ۶۷)

پیغمبر ایک عظیم الشان آفاقی انسان ہوتا ہے خواہ وہ یہ بات جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اور وہ اس کا دعویٰ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ وہ اپنے اطراف کے جغرافیائی اور تاریخی حالات میں محصور ہو سکتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: ''مجھے اللہ نے صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے۔'' شوئیٹزر (Schweitzer) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ خیال ایک ایسے مقامیت زدہ اور بخود مرتکز کلچر کی پیداوار ہے جس کے ذہن پر ایک مسیح کی وساطت سے قومی نجات پانے کا خیال چھایا ہوا تھا۔'' مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو سچائیاں اُنہوں نے پیش کیں اور جن قدروں کی حمایت کی، اُن کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔ خود مسیح نے اپنے دل میں کسی خاص گروہ سے کسی طرح کی برأت کے احساس کو پرورش نہیں کیا تھا اور قرآن نے تو بالکل ہی غیر مبہم لفظوں میں اعلان کر دیا تھا:

''اے رسول! کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف (بھیجا ہوا) اس خدا کے نبی ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔'' (الاعراف: ۱۵۸)

اور ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:

''(اے رسول) اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تمام عالموں

کے لیے رحمت بنا کر۔'' (الانبیاء: ۱۰۷)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول کا پیغام کا جسے قرآن 'دین' کی اصطلاح میں یاد کرتا ہے، تخاطب کسی خاص گروپ یا علاقے یا ملک کی طرف نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ چونکہ خدا ساری کائنات کا حاکم ہے، اس لیے ظاہر ہے اس کا وہ پیغام بھی جو رسول پر وحی کیا گیا سب کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ آفاقی انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے اندر حق کی وکالت کرنے کی جرأت پیدا کرے اور بسم اللہ کے گنبد میں بند رہ کر عافیت جوئی کی عادت کو چھوڑ دے اور اس وحشی دُنیا کے کار زار میں کود پڑنے کے لیے خود کو آمادہ کرے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اسلام نے دوسرے تمام مذاہب، ان کے رہنماؤں اور عبادت گاہوں کے لیے احترام کا اظہار کرنا مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو گویا وہ اپنے عقیدے کے ایک بنیادی اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے اپنے طریقِ عمل کے لیے قرآن یا اسوۂ رسول سے کوئی جواز نہیں مل سکے گا۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ میں کچھ ایسے بھی مسلم بادشاہ یا دوسرے صاحبانِ اقتدار گزرے ہیں جنہوں نے ایسے احترام کا مظاہرہ نہیں کیا، لیکن وہ اپنے اعمال کے لیے خود ذمہ دار ہیں جس طرح دوسرے مذاہب کے پیرو اگر ایسا توہین کا رویہ اختیار کریں تو یہ ان کا انفرادی عمل سمجھا جائے گا۔ قرآن کا اس سلسلے میں واضح فرمان یہ ہے:

> ''اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں مت دو ورنہ کہیں یہ بھی حد سے تجاوز کر کے اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کو گالیاں نہ دینے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر جماعت کے لیے اس کے عمل کو زینت بنا دیا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے، اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔'' (الانعام، ۶:۱۰۹)

اسلام یہ مانتا ہے کہ تمام بڑے مذاہب حصولِ حق کی دلالت کرتے ہیں اور اُن...

مذاہب کے بانیوں نے ان کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس لیے اُن کے درمیان کوئی معاندانہ تفریق نہیں کی جانی چاہیے۔ کسی دوسرے مذہب نے ایسی تاکید اور تکرار کے ساتھ اس انقلابی سچائی کا اعلان کبھی نہیں کیا مگر قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو احترام کو اسلام کے عقیدے کا جزو لاینفک بنا کر پیش کرتی ہیں۔

''اے مسلمانو! کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔'' (البقرۃ،۲:۱۳۶)

یہ حکم بیک وقت مثبت بھی ہے اور منفی بھی۔

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں، اُن کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

(النساء،۴:۱۵۰)

امن و آشتی کا مذہب:

اسلام انبیاء کے درمیان ہر طرح کی تفریق کی مخالفت کرتا ہے۔ جب آپ ایک نبی پر ایمان لائے ہیں تو لامحالہ دوسرے انبیاء پر بھی ایمان لانا ہوگا کیونکہ وہ سب ایک ہی روحانی

سرچشمہ سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح نجات کسی ایک خاص مذہب کی اجارہ داری نہیں رہتی۔ گویا دوسرے بالکل ہی تاریکی میں ہوں، خواہ ان کے اعمال کیسے بھی ہوں۔ حیاتِ صالحہ کی تعمیر کے لیے عقیدہ وعمل دونوں عنصر اہم ہیں۔ عقیدہ تو اس لیے اہم ہے کہ انسانی تجربات کے کچھ ایسے دائرے ہیں جنہیں سائنس یا نری منطق کی روشنی سے جگمگایا نہیں جا سکتا۔ اور کم از کم بہت بڑی اکثریت کی زندگی میں عقیدہ سخت بحران کے ایسے نازک لمحوں میں سہارا دیتا ہے اور دست گیری کرتا ہے جب اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ قالب اتنا ناتواں ہو چکا ہے کہ روح بھی کھسکنے لگے گی۔ بعض فی الواقع ممتاز شخصیات کی زندگی میں بھی، جو مذہب میں عقیدہ رکھنے یا کسی فوق الفطرت ہستی کو ماننے کی ضرورت کے منکر تھے، کچھ ایسے لمحے آئے ہیں جنہیں 'روحانی تجربات' ہی کہا جا سکتا ہے اور اُن کی کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ اُردو کے عظیم شاعر حالی نے اپنی رباعیات میں اسی بات کو ملحدوں اور لاادریوں میں بھی غیر شعوری طور پر انسان سے بالا و برتر کسی ہستی کے احساس سے تعبیر کیا ہے۔

آتش پہ مغاں نے گیت گایا تیرا ہندو نے صنم میں پایا جلوہ تیرا
دہری نے کیا دہر سے تجھ کو تعبیر انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

برٹرینڈ رسل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کچھ ایسے عجیب وغریب روحانی تجربات کا ذکر کیا ہے جن کے غیر معمولی اثرات کو الفاظ میں لانا مشکل ہے۔ ایک بار اسے اچانک یہ محسوس ہوا کہ اس کی شخصیت اور ساری کائنات کے درمیان دوئی کا احساس بالکل ختم ہو گیا ہے۔ زندگی ایک مکمل اکائی ہے اور سارے اعتبارات محض توہم ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سائنس یا منطق یا ریاضی ثابت کر سکتی ہے۔ یہ تجربہ مذہب، عقیدے اور وجدان کی دُنیا سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، اعمال بھی اتنے ہی ضروری ہیں۔ بلکہ یہ کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اکثر لوگ عقیدے کو پکڑ لیتے ہیں کیونکہ یہ ظاہری اعتبار سے نسبتاً آسان ہے۔ آپ کچھ الفاظ یا قواعد کو مانتے یا بار بار دہراتے ہیں یا

عبادت کی کچھ بندھے ٹکے رسوم وظواہر ادا کر دیتے ہیں تو آپ کسی خاص مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں، گویا 'عقیدہ' بھی فی الاصل ظواہر مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اعمال کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے جسے آپ کو ساری زندگی کرنا ہے۔ روزانہ اور زندگی کے ہر لمحے میں--- گویا آپ کو خدا کی حضوری کے انوار میں رہنا ہے جو کہتا ہے:

نحن اقرب الیه من حبل الورید۔

(میں اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں۔)

یہ کسی شخص کے کردار اور مذہبی اقدار میں اس کے عقیدے کی استواری کو جانچنے کا زیادہ صحیح پیمانہ ہے اور یہی سبب ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس معیار پر پوری نہیں اُترتی اور یہاں سے یہ رسمِ عام نکلتی ہے کہ لوگ کسی خاص مذہب کے ظواہر سے باضابطہ الحاق کو نجات یا مکتی کا دروازہ سمجھنے لگے ہیں اور اس کے دوسرے تمام عملی مضمرات کی طرف نسبتاً کم توجہ دیتے ہیں۔ میری رائے میں یہ عیسائیت کی غلط ترجمانی کی گئی کہ عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ کسی پادری کے سامنے اعترافِ گناہ کر لینا کسی شخص کے تمام گناہ اور زیادتیاں بخشوا دیتا ہے یا حضرت مسیح نے مصلوب ہو کر عیسائیوں کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے یا کوئی شخص خواہ زندگی بھر کچھ بھی کرتا رہے اس کی نجات کبھی ہرگز نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ 'عشائے ربانی' کی آخری رسم ادا نہ کی گئی ہو۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اسی طرح کی ترغیبات کا شکار ہو گئے ہیں۔

بہت سے مسلمان غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ نہ صرف نجات، اسلام کے پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے بلکہ اسلام کے بعض وہ مخصوص فرقے بھی ناجی ہیں جن سے ان کا اپنا تعلق ہے، اسی طرح دوسروں کا خیال ہے کہ چونکہ کسی بڑے روحانی پیشوا نے مرتبۂ شہادت حاصل کر لیا ہے، اس لیے ان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے اور انہیں یومِ حساب کے لیے خواہ مخواہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ صوفیا کے بعض مکاتب یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے کے بانیوں کی شفاعت کے وسیلے اور کچھ رسومِ ظاہری ادا کرنے سے انسان کو نجات مل جائے گی۔

اسلام کے نزدیک ان میں سے کسی نظریے کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ اسلام کا نظریہ تو

یہ ہے کہ خدا کے قانونِ نجات میں کوئی قومی یا مذہبی تفرقہ بندی نہیں ہے اور نہ اس میں خاندانی فخر کام آتا ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان کا عقیدہ کیا ہے اور اس کے اعمال کیسے ہیں؟ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے اس دعوے پر فہمائش کرتا ہے کہ وہ خدا کے محبوب بندے ہیں اور خاص طور پر اس کے منظورِ نظر ہیں اور انہیں اپنے گناہوں کی پاداش نہیں ملے گی یا ملے گی تو بہت ہلکی۔

> وقالت الیهود و النصری نحن ابنئوا الله و احبآئوه قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء و لله ملك السموٰات والارض وما بینهما والیه المصیر۔ (المائدہ،۵:۱۸)
>
> (اور کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کہ ہم بیٹے ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے۔ تو پھر کیوں عذاب کرتا ہے تم کو تمہارے گناہوں پر، کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو، اس کی مخلوق میں، بخشے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ ہی کے لیے سلطنت آسمان اور زمین کی اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

پھر مسلمان کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کے محبوب بندے ہیں اور اس کا قانون مکافات ان کے لیے کم و بیش بے معنی ہے، حالانکہ کوئی فرقہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو اس سے ہے کہ وہ اپنی زندگی کیسے بسر کرتے ہیں۔ کوئی شخص یا فرقہ جو اسے نفاست، استواری اور دلسوزی کے ساتھ بسر کرتا ہے وہ یقیناً اس زندگی میں جزا کا مستحق ہوگا اور آخرت میں بھی۔ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے اس معاملے میں یکساں ہونے کے نکتے پر بار بار اور غیر مبہم لفظوں میں زور دیا گیا ہے اور اس کے مختلف مضمرات واضح کر دیئے گئے ہیں۔ ایک مسلمان سے کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے:

لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوء یجز به ولا۔ یخذله من دون الله ولیا ولانصیرا ومن یعمل من الصلحت من ذکر او انثی وهو مؤمن فاولئك یدخلون الجنة ولایظلمون نقیرا۔ (۴:۱۲۳-۱۲۴)

(نہ تمہاری اُمیدوں پر مدار ہے اور نہ اہلِ کتاب کی اُمیدوں پر۔ جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پاوے گا اور نہ پاوے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار اور جو کوئی کام کرے اچھے، مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہو گا تل بھر۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

یہ تو مسلمانوں (یا دوسرے کسی بھی مذہب کے متبعین) کی ڈھٹائی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ نجات صرف انہیں کا حق ہے۔ اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں یا کیا کہتے ہیں۔ کس مرد یا عورت کو جنت میں جگہ ملنی ہے؟ وہ جو صالح عقیدہ اور اعمال رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف جہنم میں کون جائے گا؟ وہ جو برے کام کرتے ہیں اور ہمیشہ ظلم و تعدی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب میں بھی، جن میں صرف یہود و نصاریٰ ہی نہیں وہ سب قومیں شامل ہیں جن کی طرف خدا نے اپنے لاتعداد برگزیدہ بندے اور اپنے صحائف بھیجے، ایسے لوگ ہیں جو اپنے الفاظ، خیالات و اعمال سے خدا کی رحمتوں کے لیے اپنا استحقاق ثابت کر چکے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مذہب کی روح کو گم کر دیا ہے اور اعمالِ صالحہ کا ولولہ کھو چکے ہیں، وہ خدا کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی فیصلہ مجموعی طور پر سارے انسانوں کے لیے کر دینا قابلِ اعتراض اور غیر منصفانہ ہے خواہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ہو یا غیر مسلموں کے بارے میں:

لیسوا سواء من اهل الکتب امة قائمة یتلون آیت الله انآء الّیلِ وهم یسجُدونَ۔ یومِنُون باللهِ والیومِ الاخر ویأمَرُون

بالمعروف وینھون عن المُنکرِ ویسارعون فی الخیرات و اولئك من الصلحین۔ (آلِ عمران،۳:۱۱۳-۱۱٤)

(وہ سب برابر نہیں۔ اہلِ کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر۔ پڑھتے ہیں آیتیں اللہ کی، راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر اور وہی لوگ نیک بخت ہیں۔)

اس دلیل کی مزید تقویت و تائید کے لیے ایک دوسرے موقع پر قرآن کہتا ہے:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصری والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ (البقرۃ،۲:٦۲)

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین۔ جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کیے نیک تو اُن کے لیے ان کا ثواب، اُن کے رب کے پاس اور نہیں اُن پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔)

یہ بات خاصی آگے تک جاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ آگے جہاں تک ایک اوسط درجے کا مسلم یا غیر مسلم اپنی رواداری اور دوسرے مذاہب کے احترام میں جانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام اسی سے مطمئن نہیں ہوتا، اس سے بھی آگے جاتا ہے اور تمام بنی نوع انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات بھول جائیں اور مذہب کے نام پر لڑنا بند کر دیں اور بنیادی سچائیوں پر اتفاق کر لیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے باہمی تعلقات کی تشکیل کریں۔ یہ عالمی سطح پر امن و آشتی کی دعوت ہے۔ اور جنگ و پیکار کی نفی ہے۔ یہ اوّلین مذاہب میں سچائی کے وجود کو تسلیم کرنا ہے اور اس بات کا اعتراف ہے کہ تمام

انبیاء حق کے معاملے میں ایک دوسرے کے ہمنوا تھے۔

قل یااھل الکتب تعالوا الی کلمۃٍ سوآء بیننا وبینکم الانعبد الا اللّٰہَ ولا نُشرِك به سیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا ابأنّا مسلمون۔ (آلِ عمران،۳:٦٤)

(تو کہہ دو اے اہلِ کتاب! آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے۔ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔)

اس کا بنیادی مقصد عقیدے کی رسمی تبدیلی نہیں ہے جس کے بارے میں ہم آگے چل کر کچھ بحث کریں گے بلکہ یہ دوسرے مذاہب میں سچائی کے وجود کی توثیق ہے جس کا احترام اور پابندی ان مذاہب کے پیروکاروں کو سیکھنی چاہیے۔

قل یَا أهلَ الکتبِ لستُم علی شئ حتی تقیموا التورۃَ والإنجیل وما أُنزِلَ الیکم من ربکم۔ (المائدہ،۵:٦٨)

(کہہ دو اے کتاب والو! تم کسی راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو جو تم پر اُترا تمہارے رب کی طرف سے۔)

قرآن ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کیونکہ اس کا ایقان ہے کہ صحائفِ آسمانی میں پیش کی ہوئی سچائیاں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اور کسی دوسرے ذریعے سے روشنی حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ایک سچا مذہبی انسان، جس نے اس بلند تصور کو اچھی طرح جذب واخذ کر لیا ہے، نہ کبھی ایک متشدد مذہبی جنونی کی طرح برتاؤ کر سکتا ہے نہ کبھی مذہبی جبر وتعدی کا آلۂ کار بن سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انجامِ کار جو چیز دُنیا وآخرت میں زندگی کی حقیقی کامرانی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، وہ عقیدہ وعمل کا سچا امتزاج ہی ہوتی ہے۔ یہی وہ جھنڈا ہے جس کے تلے ایک

آفاقی انسان، جس کا ہم نے تصوراتی خاکہ پیش کیا ہے، زندگی کے جہاد میں شریک ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ انسان اتنی جرأت بھی رکھتا ہے کہ مذہبی عقائد میں غیر مقلد ہو جائے، جب کبھی اچھی اور بھرپور زندگی کی راہیں کھولنے کے لیے عدم تقلید کی ضرورت ہو۔ ہر زمانے میں اور خاص طور سے ہمارے عہد میں خیالات کی اتنی قوتیں اور تحریکیں وجود میں آ چکی ہیں جو زندگی بخش نہیں بلکہ مہلک ہیں، جو روحِ انسانی کے لیے کامرانیوں کے نئے دروازے نہیں کھولتیں، نہ انسانی اخوت کے احساس کو گہرا بناتی ہیں بلکہ اُنہوں نے وہ دروازے بھی بند کر دیے ہیں جو ماضی میں کھولے گئے تھے۔ کوئی شخص بھی سماجی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی، ہر دائرے میں اس مایوس کن صورت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یہ قوتیں اور تحریکیں انسان کے اس رجحان پر مبنی ہیں کہ وہ اتفاقِ عامہ اور مفادِ عامہ کے پہلوؤں کو دبائے اور اُن کی بے قدری کرے۔

یہ آفاقی انسان جو رنگ و نسل اور ذات پات کی بیڑیوں سے آزاد ہے کبھی ایسے سماجی نظام کی حمایت نہیں کرے گا جو زندگی کی بھلائیوں سے کچھ لوگوں کو محروم کرتا ہو اور دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتا ہو، کیونکہ وہ از راہِ حماقت یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صرف انہیں کا اجارہ ہیں۔ وہ ان مفروضات کی بھی نفی کرے گا جن کی بنیاد پر ایسا کوئی نظام یا تہذیب قائم ہو۔ اس کے لیے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو برادری سے الگ کر لے اور اس کے غصے اور نفرت کا نشانہ بن جائے اور رضا کارانہ طور پر اپنے لیے تنہائی اور سماجی بائیکاٹ کی زندگی پسند کر لے جیسا کہ بہت سے انبیاء اور دوسرے جرأت مند اور خیر دوست مردوں اور عورتوں کے ساتھ واقعی ہوا ہے۔

> ''کسی حد تک غیر مقلدیت انسانی ارتقاء کے لیے ضروری شرط بھی ہے اور یہی سبب ہے کہ جس زمانے میں یورپ نے کثرت سے غیر مقلدوں کو پیدا کیا، وہ سب سے زیادہ تخلیقی اور نتیجہ خیز دَور تھا جسے اب تک دُنیا نے دیکھا ہے۔'' (ممفورڈ)

وہ اپنے آباء کی کورانہ تقلید نہیں کرے گا جیسا کہ ہر زمانے میں بہت سے لوگ کرتے رہے ہیں کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس عہد نے یا وقت نے کسی خاص تحریک یا عمل کو کوئی تقدس عطا کر دیا ہے یا یہ ان کی سچائی اور معقولیت کا جواز ہو سکتا ہے۔ اصول تو یہ ہے کہ:

ان اَحسَنتم أحسَنتم لأنفسِکم وَإِن أسأتم فلھَا۔ (بنی اسرائیل، ۱۷:۷)

(اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے آپ سے۔)

ہر فرد اپنے اعمال اور ان کے انجام کا جواب دہ ہے۔ باقی دُنیا کیا کرتی ہے، اس سے لازمی طور پر اسے کوئی رہنمائی نہیں مل سکتی۔ اگر آفاقی انسان کی شخصیت اور کردار کے سلسلے میں اس رویے کی زبردست اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے خود بہ خود یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ وہ سرتا سر ایک 'امن دوست' انسان ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ جب وہ اپنے ساتھی انسانوں کو مارنے کے لیے ایٹم بم گرائے گا تو وہ درحقیقت یہ عمل اپنے ہی خلاف کر رہا ہوگا اور جب کبھی یا کہیں بھی خطرے کی گھنٹی بجے گی تو وہ درحقیقت اس کے اپنے ہی خلاف بجے گی۔

وہ اس دُنیا میں تشدد، ظلم، استحصال کے عالم گیر پھیلاؤ سے بے حس نہیں رہ سکتا، وہ ان کا جواز تلاش نہیں کرے گا، محض اس لیے کہ چند افراد یا کوئی فرقہ یا قوم جس میں اس کا اپنا فرقہ یا قوم بھی شامل ہو، اپنی روزمرہ زندگی میں ایسا کر رہی ہے۔ زندگی کی حرمت اور تقدیس پر اس کا گہرا ایمان ہوگا جیسا کہ مہاتما بدھ نے اس کی تبلیغ کی یا جیسے شوئٹزر (Schweitzer) اپنے فلسفے میں بیان کرتا ہے یا جیسے قرآنِ کریم نے غیر مبہم الفاظ میں کہا ہے، صرف یہودیوں کے لیے نہیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے بلکہ ہر عہد اور ہر عقیدے کے آدمی کے لیے:

مِن اجل ذٰلکَ کتبنا عَلی بَنی إسرائیلَ انہ من قتل نفسا بغیر نفسٍ او فساد فی الارضِ فکانما قتل النّاسَ جمیعا و من

أحياها فكانما احيا الناس جميعا۔ (المائدہ،۵:۳۲)

(اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

اس طرح بغیر کسی سبب یا جواز کے ایک شخص کو قتل کرنا ایسا ہی قابلِ مذمت ہے جیسے تمام نسلِ انسانی کا قتل اور ایک شخص کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک دوسرے کے اعضا ہیں اور ہر وہ شخص جو آفاقی انسان کے اس روّیے میں شریک ہے، جانتا ہے کہ ہمدردی، بھائی چارہ اور رحم کے جذبات ناقابلِ تقسیم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی ان سے ایک شخص کو محروم کرتا ہے وہ گویا سب کو محروم کرتا ہے۔ یہ اصول تمام قوموں اور تمام مذاہب کے لیے یکساں اطلاق رکھتا ہے اور اس کے خلاف کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔

اسلام اس حد تک نہیں جاتا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ جنگ کرنا ہر طرح کے قابلِ لحاظ حالات میں ممنوع ہے۔ کبھی ظلم کو روکنے کے لیے یا آزادیٔ فکر پر پابندی کو دُور کرنے کے لیے اس کا جواز بھی ہو سکتا ہے اور یہ اصول بھی اس وقت بنایا گیا تھا جب جنگ نسبتاً معتدل اور مہذب مشغلہ ہوا کرتی تھی۔ اب تو یہ ناقابلِ تصور دہشت بن گئی ہے۔ ایک مکمل جنگ۔

میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کی کوئی بھی تاویل خواہ وہ کتنی بھی فراست سے کی جائے ایٹمی جنگ کا جواز پیش کر سکتی ہے، خواہ وہ دفاع میں ہو یا حملہ کرنے کے لیے۔

قرآن نے ہابیل اور قابیل کی تمثیل میں اس طرح کے ذہن و مزاج کا زبردست تضاد بیان کیا ہے۔ جب دونوں بھائیوں میں اختلاف ہوا تو قابیل نے کہا: لاقتلنك (میں تجھے قتل کر دوں گا)۔ یہ ہر دور کے اس ظالم اور قاتل کی آواز ہے جو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بھائی کا محافظ ہے، خواہ اس کا سگا بھائی ہی ہو۔ ہابیل نے جواب دیا تھا:

قَال إنما يَتقبل اللهُ من المتقين لئن بسطتَ اليّ يدَك

لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیک لاقتلک انی اخاف اللہ رب العالمین۔ (المائدہ،۵:۲۷-۲۸)

(وہ بولا! اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگار سے اگر تو ہاتھ چلاوے گا مجھ پر مارنے کو، میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

یہ ایک آفاقی انسان کے ذہن کا اظہار تھا جس میں زندگی کے لیے احترام ہے، جس میں جارحیت یا اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے سے انکار ہے، خواہ بظاہر اس کا مقصد اچھا نظر آتا ہو۔ وہ درندوں کی سطح تک نہیں اُتر سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اس طرح سے بھی بہت نیچے جا پڑتا ہے کیونکہ اس نے اپنی امتیازی قوت کے عطیے کا استعمال نہیں کیا جو خیر و شر میں تمیز کرنا سکھاتی ہے اور جو خدا کی طرف سے اسے بخشی گئی ہے۔ وہ جغرافیائی انسانی ہے جو دوسرے انسانوں سے الجھ رہا ہے اور ان کے ساتھ درندوں سے بہتر اچھا سلوک کرنے سے قاصر ہے۔ درحقیقت انسان کے سامنے دو راہیں ہیں۔ ایک راستہ انتقام اور طاقت کا ہے، دوسرا معافی اور ضبطِ نفس اور محبت کا۔ قابیل نے پہلا راستہ اختیار کیا اور ہابیل نے دوسرے کو ترجیح دی۔ آفاقی انسان، جیسا کہ قرآن نے اسے پیش کیا ہے، ہابیل کی روایت کا پابند ہوتا ہے۔ پھر وہ صفات جن کا ایک آفاقی انسان میں پایا جانا ضروری بتاتا ہے، وہی صفات ہیں جن کے پیدا کرنے کے لیے مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کوئی شخص اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس میں آفاقی انسان کی کچھ جھلک موجود نہ ہو۔ اگر وہ محدود نظریات کا حامل ہے، اگر اسے ذات پات یا فرقے اور قوم کا خیال ہے یا وہ زمین سے بندھا ہوا ہے یا اس کی ہمدردی اور وفاداری اس کی جغرافیائی حدوں میں محدود ہے تو وہ قرآن کی وضاحت کے مطابق ''مسلمان'' نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔ خالق اور اس کے مقصد تکوین میں عقیدہ رکھنا، وسیع تر مفہوم ہیں، زندگی کے تمام رشتوں میں نیکی کا برتاؤ کرنا، اپنے کردار میں بدی سے دامن بچانا اور جہاں بھی بدی پائی جائے اس کا قلع قلع

کرنے کے لیے آمادہ ہونا، انفرادی نیکی یا لازمی اور انفعالی نیکی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے متعدی اور فعال ہونا چاہیے اور فرد سے باہر سماجی زندگی میں بھی تیزی سے اس کا اثر ظاہر ہونا چاہیے۔ آج ساری دُنیا ایک کنبہ بن چکی ہے، خواہ ایک فرد اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا میں ہی سرگرم کار ہو۔

آفاقی انسان خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ایسے سماج میں جنم لیتا ہے جس کی قدریں اُس کی اقدار سے نمایاں طور پر متضاد ہوں۔ ہاں کچھ مستثنیٰ شخصیات نامساعد ماحول میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور ایسی شخصیات کی مثالیں بھی موجود ہیں، خاص طور سے انبیاء، اولیاء اور حکماء کے طویل سلسلے۔ مگر یہ شخصیات یہ عام مرد و زن کے فکر اور کردار کو قابلِ لحاظ حد تک متاثر کر سکتیں، جب تک کہ وہ سماجی نظام پیدا نہ ہو جائے جو اسی روش کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہو۔

آفاقی انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے سماج کی تدریجی تعمیر میں سرگرمی سے لگ جائے۔ پیغمبر اسے اس نئے آفاقی سماج کی تشکیل کے لیے ترغیب اور ہدایت دے سکتا ہے مگر یہ کبھی بھی قطعی طور پر معرضِ وجود میں نہیں آتا، اسے مسلسل نگرانی اور بنیادی حیات بخش اقدار کی توثیق سے پرورش کیا جاتا ہے۔ کبھی کچھ قدریں جو کسی خاص زمانے سے مختص ہوں فرسودہ ہو جاتی ہیں یا نئے تقاضوں کی روشنی میں اُن کی نئی تعبیر کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے اور بھی زیادہ قوتِ ارادی اور قوتِ متخیلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ تمام معاشرتی ساختوں، ہر مجوزہ اصلاح، ہر قومی اور مقامی مہم کو اچھی طرح جانچا جائے۔ اس کی ایک ہی کسوٹی ہو سکتی ہے، کیا اس سے آنے والی آفاقی برادری کے قیام میں مدد ملے گی؟

اسلام حالتِ موجودہ کو برقرار رکھنے یا قبول کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ اس عام طور پر رائج تصور کے باوجود کہ وہ تقدیر یا قسمت کے عقیدے کا قائل ہے۔ درحقیقت بعض مغربی مصنفوں کے بقول تمام مشرقی ثقافتیں اور مذاہب اس کے قائل ہیں، مگر اسلام کا حقیقی نظریہ اقبال نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

گفتند جہان من آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

میں جانتا ہوں کہ بہت سے روایتی مفسر ہوئے ہیں اور آج بھی ہیں جو اس تعبیر سے اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ وہ ظاہر پرستی میں یقین رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفسیر و تعبیر کا یہ بے لوچ پن اسلام کی مکمل روح اور نظریۂ کائنات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس اسلامی سماج کا بنیادی نقطۂ آغاز قرآن کی اس آیت میں بیان ہوا ہے اور اس کی تفصیل متعدد مواقع پر دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے۔

> کنتُم خَیر امۃٍ اخرجَتْ للناسِ تامُرُونَ بالمعروف وتَنہون عن المنکر وتومنونَ باللہ ولو امن اھل الکتب لکان خیرا لھم منھم المؤمنون واکثرھم الفاسقون۔ (آلِ عمران،۳:۱۱۰)
>
> (تم ہو تو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئیں عالم میں۔ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہلِ کتاب تو ان کے لیے بہتر تھا کچھ تو ان میں سے ہیں ایمان پر اور اکثر ان میں نافرمان ہیں۔)

اجتماعی مقصد جو امتِ مسلمہ کے سامنے ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ دُنیا کی سب سے طاقتور قوم یا اعلیٰ ترین نسل بن جائے جیسے کہ ہٹلر کا یہ خواب کہ برتر نسل (آریہ) دُنیا پر حکومت کرے، چینیوں کا صدیوں پرانا عقیدہ کہ وہ دُنیا کی ان تمام قوموں سے افضل ہیں جو دُنیا کے دوسرے خطوں میں آباد ہیں، گولڈ اسمتھ کا یہ دل خوش کن نخوت آمیز مفروضہ کی جب وہ انگریزوں کو دیکھتا ہے تو اسے ان کے ''جلو میں بنی نوع انسان کے آقا نظر آتے ہیں''، جنوبی افریقہ والوں کا سیاہ فاموں پر اپنی برتری کا سیدھا سا عقیدہ جنہیں وہ معمولی انسانی حقوق سے بھی محروم رکھنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی مسلمانوں نے بھی مذہب کی بنیاد پر ایسی برتری کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ اسلام کی روح سے کس حد تک توافق رکھتا ہے اس کی بحث ہم کسی دوسرے موقع پر کر چکے

ہیں۔ مسلمانوں کا آئیڈیل قرآن کے مطابق یہ ہونا چاہیے کہ وہ اخلاقی سطح پر بہترین لوگ بن سکیں۔ یہاں ساری تاکید 'خیر' پر ہے، 'قوت' پر نہیں۔ فرد اور معاشرہ، دونوں کے لیے نیک اعمال کرنے کی ایک ہی دعوت دہرائی گئی ہے اور برائیوں سے پرہیز کرنے کو کہا گیا ہے:

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامُرون بالمعروفِ وینھَون عن المنکرِ و اولئك ھم المفلحون۔ (آلِ عمران،۳:۱۰٤)

(اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے، برائی سے اور وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو۔)

جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں، اس مثالی سماج کی جھلکیاں دوسری بہت سی آیات قرآنی میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور وہ اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا نقل کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ آیات اسلام کے تمام سماجی اور اخلاقی نصب العین کا احاطہ کرتی ہیں لیکن درج ذیل آیت سے اس کے وسیع تر خط و خال کا اندازہ ہو سکتا ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم الاتشرکوا به شیئا وبالوالدین احسانا ولاتقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم و ایاھم ولاتقربوا الفواحش ماظھر منھا وما بطن ولاتقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق ذالك وصّکم به لعلکم تعقلون۔ (الانعام،٦:۱۵۱)

(تو کہہ دو تم کہ آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی سے۔ ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام کے جو ظاہر ہو اس میں سے اور

جو پوشیدہ ہو اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا اللہ نے مگر حق پر۔ تم
کو یہ حکم کیا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

اگر ہم ان آیات کا تجزیہ کریں تو انہیں بہت سی ایسی سماجی اور اخلاقی نیکیوں کا جامع پائیں گے جو زندگی کو صالح بنانے میں معاون ہوتی ہیں۔ خدا میں یقین رکھنا اور شرک سے انکار کرنا، اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنا، اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت کرنا، خصوصاً اولاد کشی سے بچنا جو اس زمانے میں بہت عام تھی، ہر پست، فحش یا قبیح بات کو ترک کرنا خواہ وہ خلوت میں کی جائے یا جلوت میں، ہر طرح کے قتل سے اجتناب کرنا سوائے ان مواقع کے جہاں قانونی جواز موجود ہو، یتیموں کے مال کی حفاظت اس وقت تک کرنا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں، ہر طرح کے کاروبار اور بیوپار میں ایماندار ہونا خواہ وہ کاروبار اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ ہو یا اجنبیوں کے ساتھ، ایفائے عہد کرنا، خواہ وہ عہد بندوں سے ہو یا اللہ سے، اسے خدا کا سیدھا راستہ یعنی 'صراطِ مستقیم' کہا گیا ہے جس پر سب انسانوں کو مل کر چلنا چاہیے۔ ان آیات میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کرانے کے لیے ایک اچھے اور منصفانہ نظام کی غرض سے کچھ خاص قسم کے ادارے قائم کیے جائیں بلکہ یہ آیات ان میں سے بعض مقاصد کی صرف تشریح تک خود کو محدود رکھتی ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ یہاں سارا زور ان 'واجبات' پر ہے جو دوسرے انسانوں کے سلسلے میں ہم کو بجالانے ہیں۔ روایتی طور پر اسلامی فکر میں انسان کے فرائض کو تین خانوں میں بانٹا گیا ہے: (الف) حقوق النفس، (ب) حقوق اللہ، (ج) حقوق العباد۔ ایک مفہوم میں یہ وہ سب حقوق ہیں جو ہم پر اپنے لیے عاید ہوتے ہیں، کیونکہ خدا کو کسی طرح کسی بھی کام سے جو ہم کرتے ہیں کسی طرح کا بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ دوسرے انسانوں کے لیے بھی ہم جو کچھ کریں یا ان کے جائز حقوق انہیں ادا کریں تو اس کا نفع بھی ایک طرح سے اپنے نفس ہی کے لیے ہوتا ہے، لیکن سب لوگوں کا دوسرے کے حقوق کو کھلے دل سے قبول کرنا اور اس کی خواہش کرنا ہی مہذب زندگی کی پہچان ہے اور سماجی رشتوں کی نفاست اور بھرم کو صرف یہی چیز قائم رکھ سکتی

ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر صحیح یا غلط حق کو منوا لینا نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے لیے دل میں پختہ عزم پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کے بارے میں سمجھنا چاہیے کہ ان کا نفاذ عالمگیر سطح پر ہوتا ہے کیونکہ بصورتِ دیگر طاقتور انسان کمزور کے حقوق کو غصب کر سکتا ہے، اپنے فرائض ادا کرنے سے انکار کر سکتا ہے اور صرف اپنے نام نہاد ''حقوق'' پر اصرار کر سکتا ہے۔

اس طرح ہم آفاقی انسان کے تصور کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں جیسا کہ اسلام نے تقریباً چودہ سو سال پہلے اس کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس پر بہت سے مفکرین بھی، جن میں بعض عہد حاضر کے بڑے رہنما بھی شامل ہیں، وقتاً فوقتاً زور دیتے آئے ہیں۔ اس لیے کہ آج جو طاقتیں دُنیا کی تشکیل کر رہی ہیں، وہ اس سمت میں اس طرح اشارہ کر رہی ہیں کہ اس کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔

اسلام انسانوں میں ان صفات کا مطالبہ اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ان صفات کے بغیر نہ انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے اور نہ ان سے وہ خدا کے ساتھ اس کے مقاصد تکوین کو پورا کرنے میں اس کا شریکِ کار بن سکتا ہے۔ اس آفاقی انسان میں جس کا خاکہ ہم نے تاریخ میں کبھی واضح اور پوری شان و شوکت کے ساتھ اور کبھی دھندلا اور مبہم اور خیالی دیکھا ہے اور ان عام انسانوں میں جو دُنیا بھی میں غیر مطمئن اور غیر مکمل زندگی بسر کرتے پھر رہے ہیں، آخر کیا بنیادی فرق ہے؟ قرآن شریف کی سورۃ الفاتحہ کی عالمانہ تفسیر میں مولانا آزاد نے اس فرق کو ایک کہاوت میں سمیٹ لیا ہے جو بیک وقت مذہبی بھی ہے اور آفاقی بھی۔

الفاتحہ ایک دُعا کی شکل میں ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے دل کی ساری تمنائیں نکال کر رکھ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کس طرح کا انسان بننا چاہتا ہے۔ وہ سب لوگوں کی بھلائی کے لیے دُعا کرتا ہے خواہ ان کا کچھ بھی مذہب یا رنگ و نسل یا سماجی رتبہ ہو، اسے یہ فکر ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر چل سکے جو کوئی 'خاص' اور 'محدود' راستہ نہیں ہے بلکہ ان

سب کا راستہ ہے جن پر اللہ نے اپنی نعمتیں نازل کیں۔ وہ دُعا کرتا ہے کہ ان سب کے راستے سے بچا رہے جن پر ان کی بداعمالیوں اور ہدایت پر چلنے سے انکار کے سبب خدا کا غضب نازل ہوا۔ میں پہلے یہاں شروع سے سورۂ فاتحہ درج کروں گا:

> الحمد الله رب العالمين۔ الرحمن الرحيم۔ مالك يوم الدين۔ اياك نعبدو و اياك نستعين۔ اهدنا الصراط المستقيم۔ صراط الذين انعمت عليهم۔ غير المغضوب عليهم و لاالضالين۔ (۱:۱-۷)
>
> (ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے، وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے۔) (ترجمان القرآن: جلد۱، ص ۲۲۶)

یہاں ایک شخص خدا کی حمد بیان کر رہا ہے۔ مگر وہ رب جس کی وہ مدح کر رہا ہے کسی خاص قوم یا قبیلے یا مذہبی جماعت کا رب نہیں ہے بلکہ ساری دُنیا کا رب ہے۔ 'رب العالمین' ہے جو سارے بنی نوع انسان کا پالنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔ اس لیے تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری اور رحمت رکھتا ہے، پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اُسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی اس

کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے، وہ کہتا ہے، صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درد ماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دُنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرماں روائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر نہیں جھک سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

> ''پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی طبقے کی سیدھی راہ؟ نہیں وہ راہ جو دُنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دُنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر برائی ہے۔'' (ترجمان القرآن: جلد ا، ص ۲۲۳)

تیرہ سو سال کے بعد ہمارے عہد کے ایک عظیم باشعور انسان دوست دانش ور 'لیوس ممفورڈ' نے جس کا میں حوالہ دے چکا ہوں، ایک 'متوازن انسان' کا خاکہ کھینچا ہے۔ یہ لفظ وہ کم و بیش انہیں معنوں میں استعمال کرتا ہے جسے میں 'آفاقی انسان' کہتا ہوں۔ میں اس کا اقتباس

صرف اس لیے دینا نہیں چاہتا کہ وہ اسلامی تعریف سے قریب آ گیا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس طویل زمانے میں انسانی فکر نے ہر جہت میں بے شبہ جو ترقی کی ہے اس کے باوجود اسلام نے جن بنیادی قدروں پر زور دیا ہے اس کی کھوج میں ہم کوئی قابلِ لحاظ پیش رفت نہیں کر سکے ہیں۔

''ہم متوازن انسان کو کس طرح بیان کریں گے جسے ایک مثالی نمونہ سمجھا جائے۔ وہ کسی ایک کلچر کا نہیں ہوتا اور نہ زمین کے کسی علاقے کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے۔ نہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اپنے مذہب یا سائنس کے ذریعے حق کی واحد کنجی اس کے ہاتھ لگ گئی ہے، نہ وہ اپنی نسل یا قومیت پر فخر کرتا ہے گویا پیدائش کے اتفاقی واقعات بعض صورتوں میں خصوصاً قابلِ تعریف ہو سکتے ہیں۔ یہ پرانے قبائلی افتخار کی جمہوری پیروڈی ہے۔ اس کی جڑیں اس کے اپنے علاقے، خاندان اور پڑوس میں گہری ہوں گی اور وہ گہرائی بجائے خود دوسرے انسانوں سے مضبوط رشتے کی ضمانت ہوگی۔ مگر اس کی فطرت کا ایک حصہ مسلسل وسیع تر دُنیا سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اس کے مذہب کے ذریعے بھی اور سیاست کے ذریعے بھی اور وہ اس کے تقاضوں اور اثرات کو قبول کرنے کے لیے بھی کھلا رکھتا ہے۔''

[بہ شکریہ ''اسلام اور عصر جدید''، اپریل- جولائی ۱۹۷۷ء، اپریل ۱۹۷۸ء]